ایک آنکھ اور پاکستان

راوی: اصغری علی

تحریر: عنایت اللہ

میں نے شادی کے فوراً بعد پروین کے والد کو خط لکھ دیا تھا۔ میرا یہ خط بڑا سخت تھا۔ میں نے اس آدمی کو بہت شرمسار کیا تھا۔ اسے لکھ دیا تھا کہ آپ کو پروین کا رقعہ مل چکا ہوگا اور آپ شاہی مسجد اس کی لاش لینے گئے ہوں گے لیکن میں نے اسے مرنے نہیں دیا۔ البتہ آپ کے لیے وہ مر گئی ہے۔

پروین

بھی قرار داد کی قربان گاہ پر قربان ہونے چلی تھی لیکن میں اس کے راستے میں آ گیا اور اسے بچا لیا۔ وہ دراصل اپنی قربانی پر قربان ہو رہی تھی۔ میں نے جنگِ آزادی کی یہ کہانی اپنے سینے میں چھپا رکھی تھی مگر مجھے احساس ہوا ہے کہ یہ کہانیاں ہماری تاریخ کی ملکیت ہیں جو ہماری ابھرتی ہوئی نسلوں تک پہنچنی چاہئیں۔

یہ کہانی قوم کی اُن بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کی داستانِ جہاد ہے جو جنگِ آزادی میں ہمارے دوش بدوش لڑی تھیں۔ یہ بیٹی پنجاب کی تھی اور میں جو اس کی داستان کا ایک اہم کردار ہوں، ہندوستان کے انہی مسلمانوں میں سے تھا جن کے متعلق آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ اُن کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے پھر بھی انہوں نے قیامِ پاکستان کے لئے تن، من اور دھن کی قربانیاں دیں اور ہندوؤں نے اُن کے گھر اور خاندان تباہ کر دیئے۔

کہانی سنانے سے پہلے قیامِ پاکستان کا مختصر سا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوانوں کو اس پس منظر سے واقفیت نہیں۔ انگریزوں اور ہندو لیڈروں نے یہ تو تسلیم کر لیا تھا کہ مسلمان پاکستان سے کم کچھ بھی قبول نہیں کریں گے اور ملک کی تقسیم ضروری ہو گئی ہے لیکن انہوں نے پاکستان کو کم سے کم علاقے دینے کی سکیم تیار کر لی بلکہ پاکستان میں آنے والے صوبوں میں بھی یہ بیج ڈال دی کہ ان کے باشندے فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان میں شامل ہوں گے یا ہندوستان میں رہیں گے۔ ہمارے دو اہم صوبوں، پنجاب اور بنگال کو تو انہوں نے تقسیم کی سکیم میں آدھا آدھا کر دیا تھا۔ اس طرح مسلم اکثریت کے بہت سے علاقے جو تقسیم کے طے شدہ اصول کے مطابق پاکستان کے تھے۔ ہندوستان کو دے دیئے گئے۔

اس کے علاوہ انگریزوں نے ہندوؤں کے گٹھ جوڑ سے شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور ادھر سلہٹ آسام کے متعلق یہ حکم جاری کیا کہ وہاں ریفرنڈم (عوام کی رائے شماری) ہوگا کہ یہ صوبے پاکستان کو ملیں یا ہندوستان کو۔ بلوچستان میں لوگوں کو نہیں جرگے کو فیصلہ کرنا تھا۔ سلہٹ وغیرہ کے لوگوں کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ بنگالی مسلمانوں کا ذہن صاف تھا۔ یہ بنگالی جنہیں 1971ء میں غدار کہا گیا تھا۔ غدار نہیں تھے۔ نہ جنگِ آزادی میں انہوں نے دھوکہ دیا نہ جنگ دسمبر 1971ء میں ۔۔ صوبہ سرحد کے پٹھانوں کے جذبہ حریت کے متعلق بھی کوئی شک نہیں تھا۔ سرحد کے یہ رائفل بردار مجاہد ہی ایک سو سال سے انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے مگر وہاں یہ کمزوری پیدا ہو گئی تھی کہ صوبائی حکومت کانگرس کی تھی اور دو بہت بڑے غدار بھائی ۔۔ غفار خان اور ڈاکٹر خان ۔۔ ہندوؤں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ قبائلی پٹھانوں کے لئے یہ دونوں مجسم دھوکہ بنے ہوئے تھے۔ ان دور دراز اور دشوار گزار علاقوں میں انہوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مہاتما گاندھی مسلمان ہے۔ غفار خان اپنے آپ کو سرحدی گاندھی کہلاتا تھا۔

ہندوؤں نے اس صوبے کو ہندوستان میں شامل کرنے کے لئے اپنے خزانے لٹا دیئے تھے۔ ان کے پاس دولت تھی مالی لحاظ سے مسلمان کمزور

تھے۔ اصلی کمزوری بیان کر چکا ہوں کہ وہاں حکومت کانگرس کی تھی۔ یہ وہ خطرے تھے جو صوبہ سرحد پر منڈلا رہے تھے۔ اگر یہ صوبہ پاکستان سے کٹ جاتا تو افغانستان اور ہندوستان پاکستان کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جاتے بلکہ پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ ذرا انگریزوں کی دھاندلی پر غور کیجئے۔ سرحد مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ مگر اس میں ریفرنڈم ہو رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انگریزوں اور ہندوؤں نے در پردہ کوئی ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ وہ یہ صوبہ لے جائیں گے۔ لہٰذا قائداعظم اور مسلم لیگ کے لئے یہ صوبہ بہت بڑا چیلنج بن گیا تھا۔

میں اس وقت دلی میں تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔ ہم میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ والد دلی میں مرکزی حکومت میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اس لئے ہم ان کے ساتھ دلی رہتے تھے۔ والد نظریۂ پاکستان کے شیدائی تھے۔ باپ کا جو نظریہ ہو، اس سے بیٹے کس طرح منحرف ہو سکتے ہیں۔ ہمارے والد بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم اس جگہ (میرٹھ) کے رہنے والے ہیں، جہاں 1857ء میں مسلمانوں نے جنگِ آزادی کی ابتدا کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان اس جنگ میں ناکام ہو گئے تھے لیکن آزادی کی چنگاری بجھی نہیں۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھے انہوں نے بے جا پیار کے ذریعے بگاڑا نہیں۔ مجھے لڑکپن سے ہی جہادِ آزادی کے سبق کہانیوں کی شکل میں دینے لگے تھے۔ وہ انگریزوں کے ملازم تھے لیکن اس قوم سے سخت نفرت کرتے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ سانپ پر اعتبار کر لینا، انگریز، یہودی اور ہندو پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ اگر ان میں سے کوئی بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا کر تمہارے قریب آئے تو دو قدم پیچھے ہٹ جاؤ کیونکہ اس نے اپنے پاس خنجر چھپا رکھا ہوگا۔

1946/47ء میں جب جنگِ پاکستان فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی، میرے والد زمین دوز طریقے سے سرگرم ہو گئے۔ طلباء کا اپنا محاذ تھا۔ میں اس میں شامل ہو گیا۔ ہم جانتے تھے کہ دلی پاکستان میں شامل نہیں ہوگا لیکن ہم انگریزوں کو شکست دے کر برصغیر میں اسلامی مملکت قائم کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ہمیں ہندو طلباء اور پروفیسر وغیرہ بڑے پیار سے کہا کرتے تھے کہ تمہیں ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ پاکستان بن بھی گیا تو دلی اس میں شامل نہیں ہوگا۔ پھر تم کیوں غیر مسلموں کی دشمنی مول لیتے ہو۔ آؤ اور کانگرس کا محاذ مضبوط کرو ۔۔ ہم میں سے کوئی بھی ان کے اثر میں نہ آیا تو ہمیں دھمکیاں دی گئیں جن میں کالجوں سے نکال دینے کی دھمکیاں بھی شامل تھیں۔ ہم کالجوں سے تو نکل ہی چکے تھے۔ تعلیم سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ ہم تو اپنے ماں باپ کے زیرِ اثر بھی نہیں رہے تھے۔ ہم مسلم لیگ کے دفتر سے حکم لیتے تھے اور شب و روز اس دفتر میں یا اس دفتر کے احکام بجا لانے میں گزارتے تھے۔

ہم اس لئے بھی مستعد اور چوکنے رہتے تھے کہ قائداعظم کا ہیڈ کوارٹر دلی میں تھا۔ انہیں ہماری حفاظت کی ضرورت تو نہیں ہوتی تھی، لیکن ہم سمجھتے تھے جیسے ہمارے سوا ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں۔ ہمارے بعض ساتھی قائداعظم کی کوٹھی کے اردگرد اس طرح گھومتے پھرتے رہتے تھے جیسے انہیں پہرہ دینے کا حکم دیا گیا ہو۔ قائداعظم کہیں

جاتے تو لڑکے ان کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ جاتے اور انہیں بتائے بغیر ان کے محافظ بنے رہتے تھے۔ ان لڑکوں کے پاس چاقو ہوا کرتے تھے۔ ہمارا ایک دوست عبدالمتین جو ایک جاگیردار کا بیٹا تھا، اپنی ٹانگ کے ساتھ پتلون کے اندر گولیوں سے بھرا ہوا ریوالور باندھ کر رکھا کرتا تھا۔

پاکستان کے نام پر 1946ء میں جو الیکشن ہوئے تھے۔ اس میں مرکز کی تمام مسلم سیٹیں جن پر ہندو بھی قابض رہا کرتے تھے، مسلمانوں نے جیت لیں۔ یہ ہندوؤں کی بہت بڑی شکست تھی۔ اس فتح نے قائداعظم کی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ان پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا بھی جو کسی ہندو نے نہیں ایک مسلمان نے کیا اور مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں غداری کی جو روایات قائم کی ہیں انہیں تازہ کیا۔ یہ بہت بڑی خوش نصیبی تھی کہ اسے پولیس نے اپنی حوالات میں بند کر دیا تھا، ورنہ دلی کے نوجوانوں کی جذباتی حالت یہ تھی کہ وہ حملہ آور کو قیمہ کر دینے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ بعض لڑکے حوالات کے سامنے جا پہنچے تھے کہ اسے ذرا باہر نکال لیں تو اسے لڑکے اپنے ہاتھوں سزائے موت دیں۔

دلی کے نوجوانوں نے قیام پاکستان کے لئے جو جہاد کیا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کہوں گا کہ قوم کے وقار کے پاسبان نوجوان ہوتے ہیں بشرطیکہ انہیں نصب العین دیا جائے۔ اگر نصب العین یہ دیا جائے کہ فلاں اچھا اور فلاں بُرا ہے اور نوجوانوں کو اپنے مخالفین کو ذلیل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ اب نوجوانوں، خصوصاً طلبا کو پاکستان کے استحکام اور دفاع کے لئے نہیں بلکہ کرسی کے حصول اور دفاع کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے؟

پنجاب میں مسلمانوں نے تقریباً تمام سیٹیں جیت لیں۔ اس کے مطابق وہاں مسلم لیگ کی وزارت بنی چاہئے تھی مگر انگریز بادشاہ نے بے اصولی اور مسلم دشمنی کا انتہائی گھٹیا مظاہرہ کیا۔ مسلم لیگ کو وزارت کی تشکیل کی دعوت دینے کی بجائے اپنے ایک پٹھو خضر حیات ٹوانہ (یونینسٹ پارٹی) کو وزیراعلیٰ بنا دیا جس نے اپنی پارٹی اور کانگرس اور سکھوں میں وزارتیں تقسیم کر دیں، اس کے خلاف مسلمانوں نے تحریک شروع کر دی جو باقاعدہ معرکہ بن گئی۔ اس میں خواتین بھی شامل ہو گئیں۔ ہر روز جلوس نکلتے، لاٹھی چارج ہوتے، آنسو گیس چھوڑی جاتی اور گرفتاریاں ہوتی تھیں۔

آپ "حکایت" میں اس تحریک کی کئی کہانیاں پڑھ چکے ہیں۔ آپ تفصیلات سے واقف ہوں گے، اس لئے میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ صرف یہ کہوں گا کہ طلبا نے تعلیم ترک کر دی تھی اور خواتین بھی میدان میں آ گئی تھیں۔ یہ اسی دور کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکی نے سیکرٹریٹ میں گورنر کے دفتر پر سبز جھنڈا لہرا دیا تھا۔ ضلع کچہری اور کئی ایک سرکاری عمارتوں پر پولیس کے سخت انتظامات اور اپنی جان کے خطرے کے باوجود لڑکیوں نے سبز جھنڈے لہرائے تھے۔ سارے پنجاب میں یہ تحریک چل رہی تھی۔ اس کا مرکز لاہور تھا۔ اس چونتیس روزہ تحریک میں مسلمانوں نے خصوصاً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے جس ڈسپلن، ایثار اور جذبے کے مظاہرے کئے

ہیں، یہ ہماری تاریخ کا درخشاں باب ہے مگر یہی وہ باب ہے جو ہم اپنے آج کے نوجوانوں سے چھپائے ہوئے ہیں۔ میں پردین کی کہانی آج نوجوانوں کو سنا رہا ہوں۔

اس تحریک کے دوران بے شمار ڈرامائی کہانیوں نے جنم لیا ہے۔ خاندانوں میں چپقلش بھی ہوئی ہے۔ طلاقیں بھی ہوئیں اور منگنیاں بھی ٹوٹی ہیں۔ مثلاً بیوی مسلم لیگی ہے مگر سسرال والے انگریز کی عطا کی ہوئی جاگیر یا پنشن کی وجہ سے یونینسٹ پارٹی کے حامی ہیں یا کسی بھی پارٹی میں نہیں۔ انہوں نے بہو کو مسلم لیگ سے ہٹانا چاہا۔ بہو نہ مانی۔ اس کے والدین تک بات پہنچی۔ وہ بھی نہ مانے۔ بات بڑھی اور طلاق ہو گئی۔ ایسی قربانی دینے والی عورتیں آج بھی زندہ ہیں جو اپنے خاوندوں سے اس لئے الگ ہو گئی تھیں کہ خاوند نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے۔

میری کہانی یوں ہے کہ میں دلی میں تھا۔ ہمیں علی گڑھ سے اطلاع ملی کہ وہاں کی یونیورسٹی کے بہت سے سٹوڈنٹ لاہور جا رہے ہیں۔ کچھ چلے بھی گئے تھے۔ وہ ٹوانہ کے خلاف تحریک میں شامل ہونے کے لئے گئے تھے۔ ہمیں اطلاع دینے کا مقصد یہ تھا کہ دلی سے بھی جو لڑکے اپنے خرچ پر لاہور جا سکتے ہیں جائیں۔ اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لاہور میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ پنجاب میں چونکہ اخباروں پر سنسر کی پابندی تھی اس لئے ہمیں وہاں کی جو خبریں ملتی تھیں وہ مسلم لیگ کے اپنے ذرائع سے ہم تک پہنچتی تھیں۔ لاہور سے افواہیں بھی دلی پہنچتی تھیں۔ یہ ادھر سے دلی آنے والے مسافر سنایا کرتے تھے۔ ہمارے بعض ساتھی دلی ریلوے سٹیشن پر چلے جاتے اور لاہور سے آنے والے مسافروں سے وہاں کی خبریں پوچھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ لاہور میں باقاعدہ معرکہ آرائی ہو رہی تھی مگر بعض لوگ رائی کا پہاڑ بناتے تھے۔ ہم تک ایسی زبانی خبریں بھی پہنچیں کہ فلاں دن لاہور میں پولیس نے مسلمانوں کے جلوس پر 303 کی گولیاں فائر کی ہیں اور سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے ہیں۔ خواتین کی بے حرمتی کی خبریں بھی ملتی تھیں۔

ہمارا نوجوان خون کھولتا تھا۔ ہمارے لئے خواتین کی بے حرمتی قابل برداشت نہیں تھی۔ ہم میں سے کوئی بارہ لڑکے لاہور جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مجھے والد نے اجازت دے دی۔ ہمیں لاہور مسلم لیگ کے صوبائی دفتر میں جانا تھا۔ ہم نے اپنی تعلیم اور اپنے مستقبل کو خیرباد کہا اور لاہور پہنچ گئے۔ وہ تو جیسے فوجی ڈسپلن اور انتظام تھا۔ مسلم لیگ کے دفتر میں ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا لیکن ہوا یوں کہ لاہور کے لڑکوں نے باہر کے لڑکوں کو تقسیم کر لیا اور انہیں اپنے اپنے گھر لے گئے۔ علی گڑھ کے لڑکے پہلے ہی آئے ہوئے تھے۔ میں ان سب سے ملا۔ ہم لاہور میں پردیسی تھے۔ میں نے پہلی بار لاہور دیکھا تھا مگر لاہور کے لڑکوں نے اور لڑکیوں نے بھی ہمیں پردیس کا احساس نہ ہونے دیا۔ پہلے ہی دن اجنبیت ختم ہو گئی تھی۔

میں جس کے حصے میں آیا وہ اندرون لاہور میں رہتا تھا۔ میں اس کے گھر کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا نام محمد عمر تھا۔ کوئی تین سال ہوئے مجھے کراچی میں ایک دوست نے اطلاع دی تھی کہ غربت اور مسائل نے اسے اس حد تک پہنچا دیا تھا

کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ موت نے عمر کو شکست دی ہو گی۔ وہ تو پہاڑوں سے ٹکرانے والا نوجوان تھا مگر پاکستان بنانے والے مجاہد کو پاکستان کے حالات نے جینے کے قابل نہ چھوڑا۔

وہ پہلے روز مجھے اپنے گھر لے جا رہا تھا تو راستے میں کہنے لگا — ''اصغر یار! تم تو امیر باپ کے بیٹے معلوم ہوتے ہو۔ تمہیں میرا گھر پسند نہیں آئے گا۔ ہم کوئی امیر لوگ نہیں ہیں''۔

''عمر بھائی!'' — میں نے اسے چلتے چلتے روک کر کہا — ''میں تمہارے گھر کا معائنہ کرنے نہیں آیا۔ تم جانتے ہو میں کیوں آیا ہوں۔ ہم میں کوئی بھی امیر اور غریب نہیں''۔

میں جب اُس کے محلے میں داخل ہوا تو مکانوں کی ساخت اور اینٹوں نے مجھے مغلوں کا دور یاد دلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ عزم پختہ ہو گیا کہ ہمیں پاکستان بنانا ہے۔ اگر میں یہاں سیر کے لئے آیا ہوتا تو عمر جن گلیوں میں مجھے لے جا رہا تھا وہاں سے میں بھاگ جاتا۔ میں نے ایسا محلہ اور ایسے مکان کبھی نہیں دیکھے تھے اور میں نے اتنی تنگ گلیاں بھی کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ مکان اتنے اونچے جیسے اوپر جا کر ایک دوسرے سے مل گئے ہوں۔ بدبو بھی تھی۔ میں فراخ اور صاف ستھرے علاقے میں رہنے کا عادی تھا مگر ان گلیوں کو میں نے ناپسند نہ کیا۔ میں کسی اور مقصد کے لئے آیا تھا۔ یہی مقصد ذہن پر سوار تھا۔

عمر کا مکان نیچے والی منزل میں تھا۔ کمرے تنگ اور تاریک لیکن عمر غریب باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ یہ متوسط درجے کا گھرانہ تھا۔ عمر تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔ گھر میں معمولی سی قسم کی کرسیاں اور چارپائیاں تھیں۔ چھت کے ساتھ جالے اور دیواروں پر نمی کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ یہ مکان رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اگر میں یہاں اکیلا رہتا تو شاید مجھے اس سے ڈر بھی آتا لیکن اس مکان میں ایک تقدس تھا۔ بخدا آج بھی یہ مکان یاد آتا ہے تو ذہن میں زیارت کا تصور آ جاتا ہے۔ جی میں آتی ہے کہ وہاں جاؤں اور سجدہ کر دوں۔ یہ تقدس ایک تو عمر کی وجہ سے تھا اور اس کی والدہ، والد اور دو بھائیوں کے خلوص اور پیار کی وجہ سے بھی۔

اس کنبے نے مجھے اپنے گھر کا فرد بنا لیا۔ غیریت اور اجنبیت نہ رہی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ میں پنجابی نہیں بول سکتا۔ اب تو کوئی مانتا ہی نہیں کہ میری مادری زبان اردو ہے مگر 1947ء میں مجھے عمر کے گھرانے کا پیار دیکھ کر شرم آتی تھی کہ میں ان لوگوں کی زبان نہیں بول سکتا۔ عمر کی ماں مجھے ''اصغر پتر'' کہا کرتی تھی۔ ''پتر'' میں جو مٹھاس اور دلی پیار تھا وہ مجھے ''اصغر بیٹا'' میں نظر نہیں آتا تھا۔

عمر کے والد میرے والد کی طرح پاکستان کے نام پر جان قربان کرتے تھے۔ جلوس اور مظاہروں میں شامل ہوتے اور عمر سے دن بھر کی رپورٹ لیتے تھے کہ لڑکوں نے آج کیا کیا ہے۔ میں آپ کو اس دور اور آج کے دور میں ایک فرق بتاتا ہوں۔ تحریک پاکستان میں جب لڑکے جلوس میں شامل ہونے کے لئے جاتے تھے تو مائیں انہیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتیں اور باپ فخر سے سر اونچے کرتے تھے۔ مجھے والد نے دلی سے لاہور بھیج دیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ عمر

کے والد تو اپنی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ لڑکے زخمی ہوتے ہیں، گرفتار بھی ہوتے ہیں اور مارے بھی جا سکتے ہیں لیکن وہ اپنے بیٹے کی طرح مظاہروں میں شامل ہوتے اور عمر کی حوصلہ افزائی کرتے تھے مگر آج یہ فرق پیدا ہو گیا ہے کہ میرے بیٹے کالج جاتے ہیں تو مجھے فکر رہتا ہے کہ کسی جلوس میں نہ جا شامل ہوں۔ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ آج کے دور کی سیاست بازی سے طلبا اور طالبات کے والدین کیوں خائف ہیں۔

اسی محلے کی تین لڑکیاں تھیں جو خاصی سرگرمی سے تحریک میں حصہ لے رہی تھیں۔ انہی میں پروین بھی تھی۔ یہ تینوں متوسط گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ تینوں میٹرک پاس کر چکی تھیں۔ والدین نے انہیں کالج میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ البتہ انہیں مسلم لیگ کے شعبۂ خواتین میں کام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ان کے کرنے کے بہت سے کام تھے۔ یہ جلوسوں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ ہم جو دلی، میرٹھ اور علی گڑھ سے آئے تھے، مختلف کام کرتے تھے۔ ان دنوں زیادہ کام مظاہروں کا تھا۔ ایک کام یہ بھی کہ ہر روز ان افراد کو تیار کرنا ہوتا تھا جنہیں اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا ہوتا تھا۔ ان کی گرفتاری کے بعد ان کے گھروں کی دیکھ بھال بھی لڑکوں کے ذمے تھی۔ لڑکیاں بھی ان کے گھروں میں جاتی تھیں۔

کئی لڑکیاں شام کے بعد تک کام کرتی تھیں۔ انہیں لڑکے اپنی حفاظت میں ان کے گھروں تک چھوڑ آتے تھے۔ پروین اور اس کی دو ساتھی لڑکیاں چونکہ عمر کے محلے میں رہتی تھیں اس لئے ان کی حفاظت میرے اور عمر کے ذمے تھی۔ ان دنوں خطرہ یہ تھا کہ شام کے بعد خنجرزنی کی وارداتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ ہندو اکیلے دکیلے مسلمان کو دیکھ لیتے تو اسے خنجر مار کر بھاگ جاتے تھے۔ ایسی ایک واردات پروین اور اس کی ایک سہیلی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ یہ میرے لاہور آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

اُس روز پروین کے ساتھ ایک ہی لڑکی تھی۔ دونوں شام کے بعد تک مسلم لیگ کے دفتر میں مصروف رہیں۔ انہیں گھر پہنچانے کے لئے دو لڑکے ساتھ گئے۔ اس روز جلوس پر بڑا شدید لاٹھی چارج ہوا تھا جس سے بہت سے آدمی زخمی ہو گئے تھے۔ ان دونوں لڑکوں کو دفتر واپس جانے کی جلدی تھی۔ وہ لڑکیوں کی گلی میں پہنچے تو انہوں نے لڑکیوں سے کہا کہ انہیں واپسی کی جلدی ہے۔ لڑکیوں نے انہیں کہا کہ وہ پہنچ گئی ہیں، اب کوئی خطرہ نہیں وہ واپس چلے جائیں۔ لڑکے چلے گئے۔

اس گلی میں دور پیچھے ایک بلب روشن تھا۔ لوگ شام کو ہی گھروں کے دروازے بند کر لیتے تھے۔ پروین کو اپنے پیچھے پاؤں کی دبی دبی سی آہٹ سنائی دی اور اپنے اوپر پڑتا سایہ بھی دکھائی دیا۔ اس نے پیچھے دیکھا کہ ایک آدمی ہاتھ اوپر کئے ہوئے تھا اور اس ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ پروین کی سہیلی پر وار کرنے لگا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھ چکا تھا۔ دو تین سیکنڈ میں خنجر کو لڑکی کی پیٹھ میں اتر جانا تھا۔ پروین کو ڈر کر بھاگ جانا چاہئے تھا لیکن اس نے اچھل کر اس آدمی کے پہلو پر اس طرح لات ماری کہ اس کا دایاں پاؤں اس آدمی کے پہلو پر پڑا۔ وہ یقیناً ہندو تھا۔ وہ پروین کی لات کی ضرب اور دھکے سے دیوار کے

ساتھ جالگا۔

پروین کی سہیلی چیخ مار کر گھومی۔ حملہ آور کے گھٹنے زمین سے لگے۔ پروین نے اسے ایک اور ٹھڈ مارا جو اس کی گردن پر لگا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور بھاگ گیا۔ یہ پروین کی بہت بڑی دلیری تھی، ورنہ اس قسم کی صورت حال میں مرد بھی گھبرا جاتے ہیں اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ سوچ سکیں، حملہ آور وار کر کے غائب ہو چکا ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لڑکے لڑکیوں کو ان کے گھروں میں داخل کر کے واپس آتے تھے۔

میں اور عمر ان لڑکیوں کو کئی بار اپنے ساتھ گھر لائے۔ وہ پاک وقت تھا۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے رہتے، گھومتے پھرتے اور شام کے بعد اکٹھے گھروں کو جاتے تھے۔ کبھی کوئی ایسی شکایت نہیں آئی تھی کہ کسی لڑکے نے لڑکی کے ساتھ بدتمیزی کی ہو۔ یہ تینوں لڑکیاں مجھ میں زیادہ دلچسپی لیتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے مہمان سمجھتی تھیں۔ میں انہیں کہا کرتا تھا کہ وہ میرے ساتھ پنجابی بولا کریں۔ میں ان کے ساتھ پنجابی بولنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میری اردو پنجابی زبان کا جو حلیہ بگاڑا کرتی تھی، یہ ان لڑکیوں کو بہت اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو یوں نظر آتا تھا جیسے ہم موت کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ پولیس کا تشدد بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ پولیس جن لڑکوں کو گرفتار کر کے لے جاتی ہے ان پر وہ بہت تشدد کرتی ہے۔

انگریزوں نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اور مسلمانوں کا حق ہضم کرنے کے لئے ظالموں کی طرح مسلمانوں پر تشدد کیا۔ قوم نے خوب مقابلہ کیا اور کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ ہمیں دن اور رات کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ ایک جنون تھا جو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس دوران دن کے وقت پروین کے ساتھ کبھی کبھی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کا موقعہ ملا۔ پروین بڑی اچھی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ ذہین اور خوش طبع بھی تھی۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کے ہونے والے سسرال لاہور سے تھوڑی دور کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے۔ وہ مطمئن تھی کہ گھرانہ بھی اچھا اور لڑکا بھی اچھا ہے۔

ایک روز اس نے مجھے کہا — ''میں تمہاری شادی لاہور کی کسی لڑکی سے کرادوں گی'' — میں نے ہنس کر کہا کہ مجھے پنجابی اتنے اچھے لگتے ہیں کہ میں پنجابی لڑکی کو ہی پسند کروں گا۔

اس نے جذباتی سے لہجے میں کہا — ''اگر ہم پاکستان حاصل کر لیں پھر میری شادی ہو تو مجھے روحانی تسکین ہوگی۔ میں فخر سے کہا کروں گی کہ میں نے آزادی میں شادی کی ہے۔ میرے بچے اپنے آزاد ملک میں پیدا ہوں گے''۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا — ''انشاء اللہ ایسے ہی ہوگا''۔

ہم نے یہ معرکہ مار لیا۔ انگریز حکومت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ خضر حیات ٹوانہ کی وزارت توڑ دی گئی۔ سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے اپنی کرپان لہرا کر مسلمانوں کو للکارا اور اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے یہ الفاظ کہے — ''جو مانگے گا پاکستان، اس کو دیں گے قبرستان''۔

تحریک ختم ہو گئی مگر اس کے ساتھ ہی پروین

کی خوشیاں بھی ختم ہو گئیں۔ میں نے تحریک کے آخری تین دن اسے نہ دیکھا۔ مصروفیت اور سرگرمیاں ایسی تھیں کہ اس کا خیال بھی نہ آیا۔ تحریک ختم ہوئی تو ہم سب نے فاتحانہ سکون کا سانس لیا۔ میں نے پروین کی سہیلیوں سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تین چار روز پہلے لڑکیاں جلوس میں شامل ہونے کے لئے جا رہی تھیں۔ وہ نسبت روڈ سے گزر رہی تھیں۔ کسی ہندو نے دور سے لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لڑکیوں کو مارا۔ یہ ٹکڑا پروین کی آنکھ میں لگا۔ لڑکیوں پر دو پتھر بھی آئے۔ ایک پتھر تو دور گرا۔ ایک پتھر سے ایک لڑکی زخمی ہو گئی۔ پروین کو ایک مسلمان ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے یہ بری خبر سنائی کہ پروین کی آنکھ ضائع ہو چکی ہے۔ اسے میو ہسپتال داخل کر دیا گیا تھا۔

ہم جو لڑکے باہر سے آئے تھے وہ واپس جانے لگے تو میں عمر کے ساتھ میو ہسپتال چلا گیا۔ پروین کی آنکھ پر پٹی بندھی تھی۔ ڈاکٹر اس کی آنکھ کا آپریشن کر کے ڈھیلا نکال چکا تھا۔ پروین ایک آنکھ سے محروم ہو چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی مگر یہ مسکرانے کی ناکام کوشش تھی۔

''تم نے آزادی کے لئے بہت بڑی قربانی دی ہے'' — میں نے اس کے دل کو سہارا دینے کے لئے کہا۔

''وہ بھی تو ہیں نا، جنہوں نے جانیں قربان کر دی ہیں'' — اس نے کہا — ''ایک آنکھ تو کوئی قربانی نہیں''۔

اس کی ماں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اپنی بچی کو دیکھ رہی تھی اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ عمر

نے اس کی ماں کو اشارہ کیا۔ میں پروین کو خدا حافظ کہہ کر عمر کے ساتھ وارڈ سے باہر آ گیا۔ پروین کی ماں بھی ساتھ آئی۔

''خالہ جی!'' — عمر نے پروین کی ماں سے کہا — ''آپ پروین کے سامنے نہ رویا کریں۔ آپ نے سنا نہیں پروین نے کیا کہا ہے؟ جوان لڑکے شہید ہو گئے ہیں۔ آپ کی بیٹی زندہ تو ہے''۔

''تم ابھی بچے ہو'' — ماں نے کہا — ''اللہ نے میری بیٹی کی صرف ایک آنکھ کی نہیں، ساری عمر کی خوشیوں کی قربانی لی ہے۔ میں اس کے مستقبل پر رو رہی ہوں۔ میری اتنی خوبصورت بیٹی کا چہرہ بگڑ گیا ہے''۔

''اس کا کچھ بھی نہیں بگڑا خالہ جان!'' — میں نے کہا — ''آپ ایسے غم نہ لگا لیں جن کی کوئی بنیاد نہیں''۔

''میں نے دنیا دیکھی ہے'' — وہ کہتی ہوئی وارڈ میں چلی گئی — ''تم نادان ہو''۔

میں دلی چلا گیا۔ چونکہ آپ کو جنگ آزادی کی تاریخ نہیں سنانا چاہتا اس لئے بہت سے واقعات نہیں سناؤں گا۔ 3 جون 1947ء کے روز میرے آبائی شہر میرٹھ میں 1857ء کی جنگ آزادی کے شہیدوں اور غازیوں کے نعروں کی گونج سنائی دی۔ ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ مگر یہ پاکستان صرف نامکمل ہی نہیں تھا بلکہ اس میں سے مزید علاقے کاٹ لینے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ یہ تھا صوبہ سرحد، بلوچستان اور سلہٹ کا ریفرنڈم۔ قائداعظم نے حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ مسلم لیگی لیڈر اور ورکر صوبہ سرحد چلے جائیں اور ریفرنڈم کو اپنے حق میں کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ صوبہ سرحد میں کیا کیا خطرات تھے۔

اس موقعہ پر بھی علی گڑھ، میرٹھ اور دلی کے سٹوڈنٹ پشاور پہنچ گئے۔ ہمارے لیڈروں نے بھی پشاور کو مرکز بنا لیا۔ پشاور کے ایڈورڈ کالج اور اسلامیہ کالج کے مسلمان سٹوڈنٹ پہلے ہی سرگرم تھے۔ ہم ان کے ساتھ مل گئے۔ ہم بنوں، کوہاٹ، ٹانک اور قبائلی علاقوں تک گئے۔ شہروں میں ہم گھر گھر پھرے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کانگرس کے اثرات موجود تھے۔ خصوصاً قبائلی علاقے میں سرحدی گاندھی کے پیروکار بھی تھے۔ اللہ نے ہمارا یہ جہاد بھی قبول کر لیا اور صوبہ سرحد پاکستان کے حصے میں آ گیا۔ بلوچستان میں جرگے نے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کر دیا۔ ادھر مشرقی پاکستان کے لوگوں نے سلہٹ کو پاکستان میں شامل کر لیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے عزائم خاک میں مل گئے۔

باہر سے آئے ہوئے سٹوڈنٹ واپس جانے لگے۔ میرے دل میں لاہور کی اور عمر کے گھر کی اتنی محبت تھی کہ میں نے اپنے دلی کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ دلی چلے جائیں اور میرے گھر بتا دیں کہ میں چند دن لاہور رہ کر آ جاؤں گا۔ میں نے انہیں احتیاطاً عمر کے گھر کا ایڈریس دے دیا۔ اب ہم فارغ تھے، فاتح تھے۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ کچھ دن فراغت میں گزارنے کا ارادہ تھا۔ عمر کے گھر میں جو خلوص، پیار اور سکون تھا، وہ مجھے آگے نہیں جانے دے رہا تھا۔ اس گھر سے نکلے چھٹا مہینہ گزر رہا تھا۔ مجھے پروین کا بھی خیال آیا لیکن اس سے ملنے کی امید

نہیں تھی کیونکہ اس کی منگنی کبھی کی ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہو گی۔

میں لاہور گاڑی سے اترا اور سیدھا عمر کے گھر پہنچا۔ عمر گھر نہیں تھا۔ اس کی والدہ تھی۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولی — ''میں تے سمجھیا سی اصغر پتر سانوں بھل گیا ہووے گا''۔

میں اس عظیم ماں کو نہ اس وقت بھولا تھا، نہ آج بھولا ہوں۔ اس دور میں ہم سب کی مائیں عظیم تھیں۔ عظیم تو آج کی مائیں بھی ہیں لیکن حالات ایسے اور سیاست ایسی ہو گئی ہے کہ آج کی ماں کی عظمت پر خوف طاری ہو گیا ہے۔ کوئی ماں اپنے بچے کو کرسی کے ہنگامہ کی نذر نہیں کرنا چاہتی۔ میرے بچوں کی ماں پر بھی یہی خوف سوار رہتا ہے۔

عمر کی ماں کی ساری باتیں یاد ہیں۔ کبھی کبھی تحریک کے دوران ہم اسے مظاہروں اور پولیس کے تشدد کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ اس نے ایک روز مجھ سے پوچھا — ''عمر ڈرتا تو نہیں؟''

''نہیں خالہ جان!'' — میں نے اسے جواب دیا — ''آپ کا بیٹا بڑا دلیر ہے۔ یہ تو موت سے بھی نہیں ڈرتا''۔

اس نے سکون کی آہ بھر کر کہا — ''میرا پتر شیر اے۔ اے کسے کولوں نئیں ڈردا'' — اس نے بارک کر کہا — ''اے تے میرے کولوں دی نئیں ڈردا''۔

عمر آیا۔ ہم بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح ملے۔ اِدھر اُدھر کی گپ شپ ہو چکی تو عمر نے پروین کے متعلق ایسی خبر سنائی کہ میں کانپ اٹھا۔

"تمہیں معلوم ہوگا کہ پروین کی منگنی ہو چکی تھی" — اس نے بتایا — "اس کے سسرال شادی کے لئے کہہ رہے تھے لیکن پروین نے اپنے والدین سے منوا لیا تھا کہ شادی تحریک ختم ہونے تک ملتوی رکھیں۔ تحریک کے دوران ہی پروین کی آنکھ نکل گئی۔ اس کے سسرال اسے ہسپتال دیکھنے آتے تھے۔ پٹی کھلنے تک ان کا رویہ ٹھیک رہا۔ پٹی کھلی، پروین گھر آئی اور اس کی ہونے والی ساس اُسے دیکھنے آئی۔ وہ واپس چلی گئی اور آٹھ دس روز بعد پتہ چلا کہ اس عورت نے اپنے بیٹے کا رشتہ کہیں اور سے لے لیا ہے۔ چند دنوں بعد شادی بھی ہو گئی۔ پروین بیٹھی دیکھتی رہی۔ میں نے اُسے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھ بند ہو کر اندر کو دھنس گئی ہے۔ اسے لوہے کا جو ٹکڑا لگا تھا اس نے آنکھ کے نیچے بھی زخم کر دیا تھا۔ اس کا نشان بھی بھدا لگتا ہے۔ اس نقص نے اس کی منگنی توڑی ہے"۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ عمر نے بتایا کہ پروین کی اس منگنی سے پہلے دو اور گھروں نے اس کا رشتہ مانگا تھا۔ اس کے والدین نے جواب دے دیا تھا۔ اب منگنی ٹوٹ گئی تو پروین کی ماں نے مجبور اور پریشان ہو کر ان میں ایک لڑکے کے والدین کو در پردہ پیغام بھیجا کہ وہ پروین کا رشتہ لے لیں۔ انہوں نے ایسا جواب بھیجا جس میں انتقامی طنز تھی۔ دوسرے لڑکے کے گھر پیغام بھیجا۔ اُدھر سے جواب ملا — "ابھی تو اس کی ایک ہی آنکھ نکلی ہے۔ دوسری بھی نکل جانے دیں تو ہم رشتہ لے لیں گے"۔

میں حیران ہوا کرتا ہوں کہ میدان میں دشمن کو شکست دینے والی اور ایسی ایسی قربانیاں دینے والی قوم جس کی کوئی مثال پیش نہ کر سکے، چار دیواری کی دنیا میں آ کر اس قدر سنگدل اور تنگ نظر ہو جاتی ہے جیسے یہ وحشیوں کی قوم ہے۔ پروین کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جو راہوں میں کھڑے رہتے تھے۔ انہوں نے بھی نظریں پھیر لیں۔ اس کے رشتے کے جو خواہشمند تھے وہ بھی بیگانے ہو گئے۔

"اور اب پروین شادی کے بغیر ہی ساری عمر کے لیے بیوہ ہو گئی ہے" — عمر نے کہا۔

"عمر بھائی!" — میں نے کہا — "یہ قربانی تم نہیں دے سکتے؟ تمہیں بھی تو شادی کرنی ہے۔ کیا ایک آنکھ کم ہو جانے سے یا چہرہ ذرا سا بگڑ جانے سے عورت کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے؟ کیا پروین جیسی مجاہدہ کوڑا کباڑ بن گئی ہے؟"

"تم شاید یقین نہ کرو اصغر!" — اس نے کہا — "میں اپنے ماں باپ سے بات کرنے سے پہلے پروین کے باپ سے ملا اور اسے کہا کہ میں پروین کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے اس سے بات کرنا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ مجھے کچھ شک تھا کہ وہ نہیں مانے گا"۔

"مانے گا کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ ہماری ذات کمتر ہے" — عمر نے جواب دیا — "ہم لوہار ہیں۔ تم جانتے ہو کر میرا باپ لوہے کے ایک کارخانے میں کام کرتا ہے۔ یہ ہمارا آبائی پیشہ ہے۔ یہی ہماری ذات بن گئی ہے۔ میں نے تعلیم اس لیے حاصل کی ہے کہ خاندان کو ذات پات کے چکر سے نکال سکوں...... میرا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ پروین کے باپ نے مجھے جواب دیا۔ ہم بھٹی ہیں۔ تم جانتے ہو تمہاری ذات

کیا ہے۔ میں بیٹی کو گھر بیٹھا کر بوڑھی کر دوں گا۔ اپنے سے نیچے والی ذات کو رشتہ نہیں دوں گا۔ میں تو برادری سے باہر بھی رشتہ نہیں دوں گا ...... میں خاموشی سے واپس آ گیا''۔

انگریز جیسی شہنشاہ طاقت کی غلامی کی بیڑیاں توڑنے والی قوم اپنے ہی بنائے ہوئے رسم و رواج کی زنجیریں آج تک نہیں توڑ سکی اور ہر روز معصوم جذبات کا کشت و خون ہو رہا ہے۔ بعض گھروں میں نتائج اس سے زیادہ بھیانک بھی ہوتے ہیں۔

ایک تو پروین کو اپنی آنکھ نے اجاڑہ، دوسرے باپ نے ذات پات کا قفل لگا کر باہر کے رشتے کے لئے دروازہ بند کر دیا عمر کو افسوس تھا کہ وہ پروین کی مدد نہ کر سکا لیکن اس نے اس مسئلے کو ذہن سے نکال دیا۔ میری جذباتی کیفیت کچھ اور ہو گئی۔ مجھے اسی وقت احساس ہو گیا کہ میں پروین کو ذہن سے نہیں اتار سکوں گا۔ عمر اسی کی کوئی بات سنا رہا تھا لیکن میں بڑی گہری اور بڑی تلخ سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ اس مسئلے کا ایک ہی علاج تھا کہ میں ہی اس کے ساتھ شادی کر لوں لیکن میرے سامنے ایک رکاوٹ یہ تھی کہ میری منگنی ہو چکی تھی۔ یہ لڑکی مجھے پسند تھی اور میں اسے پسند تھا۔ میں یہ قربانی دے سکتا تھا مگر سب سے بڑی رکاوٹ پروین کے باپ نے پیدا کر رکھی تھی۔

میں عمر کے منع کرنے کے باوجود پروین کے گھر چلا گیا۔ دروازہ پروین نے کھولا مجھے دروازے میں کھڑا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ اس نے خراب آنکھ پر دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی اچھی بھلی آنکھ جو مجھے نظر آ رہی تھی اس سے آنسو بہنے لگے۔

''میں تمہارے ابا جان سے ملنے آیا ہوں'' ــــ میں نے کہا۔

''گھر میں کوئی بھی نہیں'' ــــ اس نے کہا ــــ ''اکیلی ہوں۔ اندر آ جاؤ۔ میں تمہیں زیادہ دیر بٹھا نہیں سکوں گی۔ لوگ باتیں بناتے ہیں''۔

مجھے اندر نہیں جانا چاہیے تھا لیکن میری نیت کچھ اور تھی، ارادہ کچھ اور تھا۔ میں اندر چلا گیا اور بے تکلفی سے اس کی خراب آنکھ سے دوپٹہ ہٹا دیا۔ اس کا چہرہ ان لوگوں کے کام کا نہیں رہا تھا۔ جو لڑکی دیکھ کر شادی کیا کرتے اور کہا کرتے ہیں کہ لڑکی لاکھوں میں ایک ہے چاند کو شرماتی ہے۔ بیٹھی ہوئی، بند اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھ اور اس کے نیچے زخم کے داغ نے اتنے حسین چہرے کی ساری کشش ختم کر ڈالی تھی۔

''تم پر جو گزری ہے وہ میں عمر سے سن آیا ہوں'' ــــ میں نے کہا ــــ ''اچھا ہوا تم اکیلی مل گئی ہو۔ میں تمہارے ابا جان سے تمہارا رشتہ مانگنے آیا ہوں''۔

''عمر بھی آیا تھا'' ــــ اس نے کہا ــــ ''اسے میرے ابا جان نے معلوم نہیں کس لہجے میں جواب دیا تھا۔ وہ چلا گیا تو ابا جان بہت دیر اسے برا بھلا کہتے رہے تھے''۔

''کیا کہتے تھے؟''

''کہتے تھے کہ کالج میں دو جماعتیں پڑھ کر سمجھتا ہے کہ اس کی ذات ہمارے برابر ہو گئی ہے۔ پھر گالیاں دیتے رہے۔ پھر غصے سے مجھے کہنے لگا

ــــ ''اگر تو گھر بیٹھی رہتی تو تیرا یہ حال نہ ہوتا۔ آج تیری وجہ سے میری یہ بے عزتی ہوئی ہے کہ لوہاروں کا بیٹا تیرا رشتہ مانگنے آیا ہے'' ــــ ان کا خیال ہے کہ میں اپنی غلطی سے زخمی ہوئی ہوں اور ان کا دماغ اتنا اونچا ہے کہ لوہاروں کو یہ اچھوت سمجھتے ہیں ...... مجھے اس کا غم نہیں کہ میں ٹھکرائی گئی ہوں اور مجھے اب کوئی کوئی بھی قبول نہیں کر رہا۔ مجھے غم یہ کھا رہا ہے کہ مجھے ماں بھی کبھی کبھی طعنہ دے دیتی ہے اور باپ بھی کہ میں اپنی غلطی سے زخمی ہوئی ہوں اور ان کے لیے مسئلہ بن گئی ہوں''۔

''مجھے بھی تمہارے ابا جان یہی جواب دیں گے جو انہوں نے عمر کو دیا تھا؟'' ــــ میں نے کہا ــــ ''اگر مسئلہ ذات کا ہی ہے تو میری ذات تم سے کم نہیں''۔

''نہ بات کرنا'' ــــ اس نے جواب ــــ ''وہ کہیں گے کہ ہم برادری سے باہر رشتہ نہیں دیتے۔ تم تو اتنی دور کے رہنے والے ہو ...... تم چلے جاؤ اصغر! محلے والے معلوم نہیں کیا باتیں بنائیں''۔

''مجھے کہیں اور مل سکو گی؟''

''آ جاؤں گی'' ــــ اس نے ذرا سوچ کر کہا ــــ ''عمر کے گھر آ سکتی ہوں۔ تم جاؤ ...... یہ یاد رکھنا اصغر! میرے ابا جان سے بات نہ کرنا۔ پریشان ہو جاؤ گے۔ میں تمہاری قربانی کی کوئی قیمت نہیں دے سکتی۔ اتنا کر سکتی ہوں کہ جہاں بلاؤ گے وہاں آ ؤں گی''۔

اس کے ساتھ اگلی ملاقات چار پانچ روز بعد عمر کے گھر میں ہوئی۔ عمر کی ماں کو پتہ نہ چل سکا کہ پروین میرے پاس بیٹھی ہے۔ پروین نے مجھ سے

پوچھا کہ میں کتنے دن لاہور رہوں گا۔

''صرف تمہارے لیے رکا ہوا ہوں'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے ابا جان سے بات نہ کروں لیکن میں ان کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں''۔

''نہیں اصغر!'' ـــــ اس نے کہا ـــــ ''اگر میرے ابا جان مان گئے تو بھی میں تمہاری یہ قربانی قبول نہیں کروں گی''۔

''قربانی کیسی؟'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''تم کوڑھی یا اپاہج نہیں ہو۔ دق کی مریض نہیں ہو۔ پاگل نہیں ہو۔ صرف ایک آنکھ نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑ گیا''۔

''مجھے محلے اور برادری کی عورتوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ میں اب کسی مرد کے قابل نہیں رہی اور میں دھتکاری گئی ہوں'' ـــــ اس نے کہا ـــــ ''محلے کی عورتیں ہمارے گھر آتی ہیں تو ہمدردی کے پردے میں ایسے ایسے تیر چلا جاتی ہیں جو مجھے راتوں کو سونے بھی نہیں دیتے۔ کوئی کہتی ہے کہ گھر میں محلے کی بچیوں کو قرآن پڑھایا کرو۔ کوئی کہتی ہے کہ کسی سکول میں نوکری کر لو۔ یہ پہاڑ جیسی جوانی گھر بیٹھے کس طرح گزرے گی۔ میں بچیوں کو قرآن بھی پڑھا سکتی ہوں۔ سکول میں نوکری بھی کر سکتی ہوں، مگر مجھے یہ مشورے ایسے انداز دیئے جاتے ہیں جیسے مجھے اب یہ معاشرہ بھی قبول نہیں کرے گا اور میں کوئی گناہ کر بیٹھی ہوں جس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے مجھے مشورے دیئے جا رہے ہوں...... میری سہیلیوں نے مجھے بتایا ہے کہ محلے کی عورتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ یہ گھومنے پھرنے والی لڑکی ہے۔ اس کی شادی نہ ہوئی تو یہ خراب ہو جائے گی۔ ایک آنکھ ضائع ہونے سے یہ کسی کی بیوی نہیں بن سکتی، ویسے جوان اور خوبصورت تو ہے۔ یہ باپ کی عزت ڈبوئے گی''۔

ان تنگ و تاریک گلیوں اور کمروں میں زندگی گزارنے والی عورتوں کو ایک دلچسپ موضوع مل گیا تھا۔ ان تنگ و تاریک محلوں میں ہی یہ کچھ نہیں ہوتا، اچھے اچھے علاقوں میں بڑے مکانوں اور کوٹھیوں میں رہنے والوں کی ذہنیت بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ کسے موضوع اور تماشہ بنا لیا گیا ہے۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب پاکستان بننے میں چند دن باقی تھے۔ لاہور میں خنجر زنی کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ پہلے ہندو اکیلے دکیلے مسلمان کو دیکھ کر قتل کر دیتے تھے۔ اب مسلمانوں نے بھی جوابی کارروائی کے طور پر اکیلے دکیلے ہندوؤں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ مجھے ایک دو ہندوؤں کو قتل کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں اور عمر دو تین راتیں چاقو لیے گلیوں میں شکار کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہے مگر کوئی شکار نہ ملا۔

ہندوستان میں کئی جگہوں سے مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں ملنے لگی تھیں۔ مختلف سرکاری محکموں کے ملازموں سے پوچھا گیا تھا کہ وہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں۔ ہندوستان سے پاکستان آنے والے سرکاری ملازموں کو 14 اگست سے پہلے ہی پاکستان بھیجا جانے لگا تھا۔ ان میں سے ایک ریل گاڑی کے نیچے ہندوؤں نے بم رکھ دیا تھا جو پھٹا اور کچھ جانی نقصان ہوا تھا۔ دلی میں مرکزی دفتر سے جو مسلمان ملازم پاکستان آ رہے تھے۔ ان کی بھی الگ

ریل گاڑی آئی تھی اور انہیں کراچی لے گئے تھے۔ وہاں معمولی اور سیدھی سیدھی سی بارکیں کھڑی کر کے ان میں مرکزی حکومت کے دفاتر بنائے گئے تھے۔

میں نے لاہور اترتے وقت اپنے دوستوں کے ہاتھ والد کو عمر کے گھر کا ایڈریس لکھ دیا تھا کیونکہ حالات مخدوش ہوتے جا رہے تھے۔ بوقت ضرورت ایک دوسرے کو اطلاع دینے کی ضرورت تھی۔ میرا بھیجا ہوا ایڈریس میرے کام آ گیا۔ مجھے دلی سے والد کا خط ملا کہ وہ دلی سے کراچی جا رہے ہیں۔ ہمارا سارا خاندان کراچی آ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میں اب دلی نہ جاؤں۔ چھ سات روز بعد کراچی سے والد کا خط آیا۔ سب لوگ خیریت سے آ گئے تھے۔ انہوں نے کراچی کا ایڈریس لکھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں کراچی آ جاؤں۔ میں کراچی جانے کی تیاری کرنے لگا ایک تو عمر ابھی اور روکنے کو کہہ رہا تھا۔ دوسرے پروین میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی اس لیے میں چند دن اور لاہور رک گیا۔

اس دوران پروین کے ساتھ میل ملاقات رہی۔ وہ جب بھی ملتی، مجھے سناتی تھی کہ اس کے ساتھ گھر والوں کا اور محلے کی عورتوں کا رویہ کیا سے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر طنز تو کوئی نہیں کرتا تھا۔ وہ خود ہی حساس ہو گئی تھی۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اس کی پیٹھ پیچھے عورتیں جو باتیں کرتی تھیں وہ اس تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ یہ چوٹ اس کے لیے ناقابل برداشت تھی کہ اس کی منگنی ٹوٹی اور دو گھروں میں اس کا رشتہ پیش کیا گیا تو کسی نے قبول نہ کیا۔ مجھے یہ افسوس ہوتا تھا کہ آزادی کے جہاد کی ایک مجاہدہ کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا تھا اور وہ جہاد کے دوران زخمی

ہوئی تھی۔

مجھے جب والد کا یہ خط ملا کہ وہ کراچی آ گئے ہیں اور کراچی میں پاکستان کا سیکرٹریٹ بن رہا ہے تو مجھے عجیب سی خوشی ہوئی۔ پروین ملی تو میں نے اسے بتایا کہ کراچی میں پاکستان کی حکومت کے دفاتر بن رہے ہیں اور اس فتح میں تمہارا خون شامل ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ خوشی کا اظہار کس طرح کروں۔ میں تو صرف سکول اور کالج کے امتحانوں میں پاس ہونے کی خوشی سے واقف تھا۔ آزادی کی خوشی میرے لیے انوکھی تھی کبھی تو جی چاہتا کہ اٹھ کر ناچنے لگوں اور یہ بھی دل میں آئی کہ پروین کو سینے سے لگا لوں۔

میں جب زیادہ جذباتی ہو گیا تو پروین کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور میں نے بے اختیار کہا ___ ''پروین! ہم آزاد ہو گئے ہیں۔ دو تین دنوں بعد تم سرکاری عمارتوں پر پاکستان کا جھنڈا دیکھو گی''۔

پروین کے آنسو نکل آئے۔ پھر وہ سسکنے لگی۔ میں نوجوان تھا۔ کسی روتے کو بہلانے کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ میں اسے دیکھتا اور پریشان ہوتا رہا۔

''تمہیں یاد ہے اصغر؟'' ___ اس نے کہا ___ ''میں نے ایک روز کہا تھا کہ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی آزادی کے بعد ہو اور میرے بچے اپنے آزاد ملک میں پیدا ہوں...... میری شادی تو ہو گی نہیں''۔

''مجھے اپنے ابا جان سے ملنے دو'' ___ میں نے کہا ___ شاید مان جائیں''۔

''میرا باپ جاہل ہے'' ___ اس نے دانت پیس کر کہا۔ اس سے پہلے اس نے اپنے باپ کی اس طرح کبھی توہین نہیں کی تھی۔ بولی ___ ''اس کے پاس نہ جانا...... اور سنو اصغر! میرا باپ مان بھی گیا تو میں انکار کر دوں گی۔ میں تمہیں اتنے بڑے امتحان میں نہ ڈالوں گی۔ تم کراچی چلے جاؤ اور مجھے بھول جاؤ'' ___ ذرا سوچ کر بولی ___ ''14 اگست کے بعد جانا۔ آزادی کے پہلے روز میرے ساتھ رہنا''۔

ایک دو دنوں کی بات تھی میں رک گیا ...... اور آزادی کی صبح طلوع ہوئی۔ پروین بہت سویرے آ گئی۔ بہت خوش تھی۔ عمر خوش تھا۔ عمر کی ماں خوش تھی، عمر کا باپ خوش تھا اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ یہ خوشی کس قسم کی تھی تو میں بیان نہیں کر سکوں گا۔

پروین کے جذبات مجروح تھے۔ اسے ذرا سکون دینے کے لیے میں نے اسے کہا کہ پروین، یہ پاکستان تمہارا ہے۔ تم نے بنایا ہے۔

وہ اپنی خراب آنکھ دوپٹے سے چھپائے رکھتی تھی۔ میری بات سن کر اس نے دونوں آنکھیں دوپٹے میں چھپا لیں اور وہ کمرے سے نکل گئی۔

اس کے بعد کی ایک ملاقات میں بھی اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے دل سے میری محبت کبھی نہیں نکلے گی...... میں مجبور ہو گیا اور اگلے روز کراچی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ پروین آخری ملاقات کے لیے آئی اور بہت روئی۔ کہنے لگی ___ ''تم چلے جاؤ گے تو میں دل کی باتیں کس کے ساتھ کیا کروں گی۔ سہیلیوں سے تو میں یہ کہا کرتی ہوں کہ مجھے اپنی شادی کا کوئی غم نہیں۔ میں ان کے ساتھ یہ باتیں نہیں کیا کرتی جو تمہارے ساتھ کر لیتی ہوں''

میں اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس نے پوچھا کہ کل میں کون سی گاڑی سے جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ شام کے بعد ایک گاڑی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ کل دن کو کسی وقت آؤں گی۔ عمر ہماری ملاقاتوں میں مددگار تھا۔ پروین آ گئی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اکھڑی ہوئی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھکانے نہیں تھی۔ آتے ہی کہنے لگی کہ تم باہر چلے جاؤ، میں آ جاؤں گی۔ آج باہر نکلنے کو جی چاہ رہا ہے۔

میں باہر نکل گیا۔ وہ مجھ سے کچھ دور پیچھے پیچھے آ گئی۔ ہم تانگوں کے اڈے کے پاس اکٹھے ہوئے۔

''شاہی مسجد چلو'' ___ اس نے کہا ___ ''مینار پر چلیں گے۔ وہاں سے مجھے سارا پاکستان نظر آئے گا''۔

اس کا لب و لہجہ مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ میں نے اسے تانگے میں بٹھایا اور ہم شاہی مسجد چلے گئے۔ اندر گئے اور مینار پر چڑھنے کے دو ٹکٹ لے کر اوپر چلے گئے۔ ان دنوں مینار پر کوئی نہیں چڑھتا تھا۔ کسی کو سیر کی ہوش نہیں تھی۔ مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے آ رہے تھے۔ لاہور میں بھی بدامنی تھی۔ مسلمان یہاں کے ہندوؤں سے مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے مسلمانوں کے خون کا انتقام لے رہے تھے۔

میں اور پروین مینار پر کھڑے تھے۔ میں نے پروین کو بٹھا لیا وہ برقعے میں تھی۔ اس نے مینار سے ہر طرف دیکھا۔ لاہور ہمارے پاؤں کے نیچے تھا۔ میں پہلی بار مینار پر گیا تھا۔ پروین نے ٹھیک کہا تھا کہ مینار سے سارا پاکستان نظر آئے گا۔ افق سے افق تک کی وسعت نظر آ رہی تھی۔

پروین اٹھ کھڑی ہوئی اور مینار سے جھکی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ پھر نیچے دیکھا جیسے بلندی کا اندازہ کر رہی ہو۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر کہا ___ ''بیٹھ جاؤ پروین! اتنا نہ جھکو''۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور کہا ___ ''پروین کب تک روتی رہو گی''۔

اس نے اچانک اپنا سر میرے سینے پر پھینک دیا اور بڑی ہی بلند اور رندھی ہوئی آواز میں بولی ___ ''اصغر! مجھے مرنے سے بچا لو۔ میں آج یہاں سے چھلانگ لگا کر مرنے کے لیے آئی تھی۔ میں بزدل ہوں میں دکھی ہوں اصغر! مجھے مرنے سے بچا لو''۔

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اسے اپنے بازو میں لیا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ اوپر زیادہ دیر رکنا خطرناک تھا۔ نیچے آ کر ہم بارہ دری کے باغ میں بیٹھ گئے۔

''میں مرتے وقت تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی'' ___ اس نے کہا ___ ''میں گھر اپنے تکیے کے نیچے اپنے ماں باپ کے نام رقعہ چھوڑ آئی ہوں۔ میں نے لکھا ہے کہ میں اتنی دکھی ہوں کہ زندگی کے جہنم سے آزاد ہونے جا رہی ہوں۔ شاہی مسجد کے مینار سے پاکستان کو دیکھ کر چھلانگ لگا دوں گی اور پاکستان کی مٹی میں مل جاؤں گی''۔

اس نے ایک اور انکشاف کیا۔ وہ یہ کہ اس کی برادری کا ایک لڑکا اسے دل و جان سے چاہتا تھا

اور پروین کے دل میں بھی اس کی محبت تھی۔ ماں باپ نے پروین کی منگنی کہیں اور کردی۔ وہ پھر بھی اس لڑکے سے ملتی رہی۔ آنکھ نکل جانے کے بعد جب پروین کو ہر طرف سے جواب مل گیا تو وہ اس لڑکے سے ملی۔ یہ اس کی برادری کا لڑکا تھا۔ شادی ہو سکتی تھی مگر لڑکے نے بھی اسے دھوکہ دیا اور اس سے میل ملاقات ترک کردی۔ یہ آخری چوٹ تھی جس نے اس کا دل توڑ دیا اور وہ خودکشی کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی۔ وہ شاید اپنا دل مضبوط رکھنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

میں نے اسے کچھ بھی سوچنے کی مہلت نہ دی۔ اسے اٹھایا باہر جا کر تانگے میں بیٹھے اور میں اسے ریلوے سٹیشن لے گیا۔ ان دنوں لاہور ریلوے سٹیشن آج والا سٹیشن نہیں تھا۔ پلیٹ فارموں پر پناہ گزینوں کا اتنا ہجوم کہ چلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ گاڑیوں کے آنے جانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ میں نے پروین کو اس ہجوم میں ایک جگہ بٹھا دیا اور اسے کہا کہ میرے آنے تک وہ یہیں رہے۔ میں باہر نکلا اور تانگہ لے کر عمر کے گھر گیا۔ اسے کچھ بھی نہ بتایا۔ اپنا اٹیچی کیس اور بستر اٹھایا عمر میرے ساتھ تانگے تک آیا۔ وہ سٹیشن تک ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے کچھ جھوٹ بول کر اسے اپنے ساتھ نہ چلنے دیا۔

پروین وہیں بیٹھی تھی جہاں میں اسے بٹھا آیا تھا۔ تب اسے بتایا کہ میں اسے کراچی لے جا رہا ہوں۔ وہ ذرا گھبرائی لیکن میرے دل میں کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ میں نے تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ لیے۔ شام کے وقت ایک گاڑی کراچی کے لیے تیار ہوئی۔ ہم دونوں ہجوم میں سوار ہو گئے۔ بڑا ہی تکلیف دہ سفر تھا۔

میں جب کراچی اپنے خاندان میں پہنچا تو ایک جوان لڑکی کو میرے ساتھ دیکھ کر سب چپ سے ہو گئے۔ میں نے والد کو الگ کر کے پروین کی ساری کہانی سنائی اور انہیں کہا میں پروین کے ساتھ شادی کروں گا۔ والد تو مان گئے۔ والدہ کو مناتے دشواری پیش آئی جس لڑکی کے ساتھ دلی میں میری منگنی ہوئی تھی وہ بھی کراچی آ گئی تھی۔ والدہ لڑکی والوں کے سامنے شرمسار ہونے سے ڈرتی تھیں۔ انہوں نے پروین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا میں نے پاکستان پر دلی قربان کر دی ہے تو اپنا یہ گھر بھی قربان کر سکتا ہوں۔ میں گھر میں نہیں رہوں گا۔ والدہ مان گئیں۔

میری اور پروین کی شادی ہو گئی۔ میں نے دو مہینوں بعد اس وقت اللہ کا شکر ادا کیا جس روز میری والدہ نے مجھے کہا___ ''اگر دو آنکھوں والی بہو ہوتی تو شاید اتنی اچھی نہ ہوتی''۔

میں نے شادی کے فوراً بعد پروین کے والد کو خط لکھ دیا تھا۔ میرا یہ خط بڑا سخت تھا۔ میں نے اس آدمی کو بہت شرمسار کیا تھا۔ اسے لکھ دیا تھا کہ آپ کو پروین کا رقعہ مل چکا ہوگا اور آپ شاہی مسجد اس کی لاش لینے گئے ہوں گے لیکن میں نے اسے مرنے نہیں دیا۔ البتہ آپ کے لیے وہ مر گئی ہے۔

اس کے باپ کا آج تک جواب نہیں آیا۔